میں بھجوادی گئیں اور حکم جاری کر دیا گیا کہ (۱) دوسرے تمام نسخے تلف کر دیئے جائیں (۲) تلاوتِ قرآن صرف لہجۂ قریش میں کی جائے یعنی سرکاری نسخے کے مطابق۔ اس وقت سے آج تک وہی قرآن مجید نقل در نقل ہم تک پہنچا ہے۔ دورِ عثمانی کے چند نسخے آج بھی موجود ہیں۔ مستشرقین اور مؤرخین نے ان کے ساتھ موجودہ نسخوں کو ملایا تاکہ اختلافات کو ہدفِ تنقید بنایا جائے مگر آخر کو وہ بھی پکار اٹھے کہ آج کا قرآن اور دورِ عثمانی کا مصحف ایک ہی چیز ہے۔

جاہلوں، منافقوں اور غیر مسلموں نے عناد کے اظہار کے طور پر تدوینِ قرآن پر اعتراضات کیے جن کا شافی و مسکت جواب دیا گیا۔ ذیل میں عیسائیوں کی طرف سے کیے گئے چند اعتراضات پرکھنا کمہ پیشِ خدمت ہے۔ عیسائی کہتے ہیں کہ قرآن مجید میں بھی کمی بیشی ہوئی ہے جس کی تفصیل یہ ہے۔ اول: عبداللہ بن مسعودؓ کے نزدیک مُعَوّذتَین داخلِ قرآن نہیں لیکن مصحفِ عثمانی میں ان کو داخل کر دیا گیا۔

دوئم: اہلِ تشیّع کا دعویٰ ہے کہ بعض آیات اور سورتیں خاص کر جو اہلِ بیت کی شان میں تھیں مصحفِ عثمانی سے خارج کر دی گئیں۔ ان وجوہ سے یہ معترضین کہتے ہیں کہ مروّجہ قرآن جو مصحفِ عثمانی کی نقل ہے، ناقص اور محرّف ہے لیکن یہ دعویٰ بے بنیاد اور باطل ہے۔ جو کہ تحریفِ تورات و اناجیل کے ثابت شدہ الزام کی پردہ پوشی کے طور پر یہ اعتراض کیے گئے ہیں۔ جن کا ردّ درج ذیل ہے۔

اعتراض اول۔ اگرچہ علامہ ابن حجر عسقلانیؒ نے فتح الباری شرح صحیح بخاری میں احمد اور ابن حبان کی روایت سے یہ لکھ دیا ہے کہ حضرت ابن مسعودؓ معوّذتَین کو قرآن میں نہیں لکھتے تھے، لیکن محدّث ابن حزمؒ اپنی کتاب "قدح المعلّٰی" میں لکھتے ہیں کہ "یہ ابنِ مسعودؓ پر جھوٹا الزام ہے۔ اور یہ قول بھی موضوع ہے (کہ ابنِ مسعودؓ معوّذتین کو داخل قرآن نہیں سمجھتے تھے) کیونکہ ابن مسعودؓ کی جو صحیح قرأت زر کے واسطے سے عاصم نے کی ہے اس قرأت میں معوّذتین شاملِ قرآن ہیں (بحوالہ اتقان نوع ۲۲) اسی طرح علامہ ابنِ نوویؒ "مہذب" کی شرح میں رقم طراز ہیں کہ "(معوّذتین کو داخلِ قرآن نہ سمجھنے کے سلسلے میں) ابن مسعودؓ کا جو قول نقل کیا گیا ہے وہ سراسر باطل اور غلط ہے"۔

الغرض اعتراض محال حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کے معوّذتَین کے داخلِ قرآن نہ ہونے

© rasailojaraid.com

کے قول کو تسلیم کر لیا جائے تو سوال یہ ہے کہ:

(۱) کیا حضرت ابن مسعودؓ نے اپنا نسخہ اس کامل احتیاط، خوب غور و فکر اور محنتِ شاقہ کے بعد مرتب کیا تھا، یا حضرت زیدؓ بن ثابت نے نسخہ قرآن کو زیادہ احتیاط کے ساتھ مرتب کیا تھا؟ کیا تاریخ و روایات سے اس کا ثبوت پیش کیا جا سکتا ہے؟

(۲) کیا مصحفِ صدیقیؓ (پھر مصحفِ عثمانیؓ) پر اس دور کے حفاظ صحابہؓ کا اتفاق زیادہ تھا۔ یا حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کے مرتّب کردہ نسخہ پر؟

(۳) کیا کاتبِ رسولؐ ہونے کا شرف حضرت ابن مسعودؓ کو حاصل ہے یا حضرت ابی ابن کعبؓ کو؟ (دونوں کے کاتب ہونے کی صورت میں عرصۂ کتابت کو زیرِ غور لایا جا سکتا ہے) جن سے (حضرت اُبَی بن کعبؓ) صحیح بخاری میں معوّذتین کے بارے میں یہ روایت آئی ہے کہ:

© rasailojaraid.com

اُبَی ابن کعبؓ سے معوّذتین کے متعلق پوچھا۔ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا تھا۔ اور آپؐ نے فرمایا تھا کہ "مجھ سے ایسا ہی کہا گیا (یعنی یہ سورتیں مجھ پر نازل ہوئی ہیں) پس میں نے یہی کہا اور اب ہم وہی کہتے ہیں جو ہم سے رسولؐ اللہ نے فرمایا"۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں سورتوں کو نماز میں پڑھا۔ بیماری کی حالت میں اکثر پڑھا۔ بعض آدمی سمجھے کہ یہ ردِّ سحر کی دعائیں ہیں لیکن یہ ان کی غلطی تھی۔ بزاز سے یہ منقول ہے کہ "حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے آخر میں اپنے قول سے رجوع کر لیا تھا"۔ (بحوالہ تیسیر القاری جلد چہارم) شیعوں کی مشہور کتاب "حدیث الکافی" میں ہے کہ

"حضرت امام جعفر صادقؒ سے روایت ہے کہ آپ سے معوّذتین کے متعلق کہ یہ داخل قرآن ہیں پوچھا گیا۔ آپ نے فرمایا۔ ہاں! وہ شاملِ قرآن ہیں۔ ایک شخص کہنے لگا کہ ابن مسعودؓ کی قرائت میں داخل قرآن نہیں۔ آپ نے فرمایا۔ ابن مسعودؓ نے غلطی کی"۔

تسمیہ (بسم اللہ الرحمٰن الرحیم) کے سورتوں کے آغاز میں بطور نشانی لکھے اور پڑھے جانے کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ معوّذتین (سورۃ الفلق اور سورۃ الناس) ایک ہی دفعہ نازل ہوئیں۔ ان میں فرق محسوس نہ کیا جا سکا اور ان دونوں سورتوں کو ایک ہی سمجھ لیا گیا۔ بعد

© rasailojaraid.com

میں جب صحیح صورتحال کاانکشاف ہواتوان میں فرق کیلئے (خاص طور پر) اور دوسری قرآنی سورتوں کے آغاز میں بطور نشانی کے تسمیہ کا تحفہ عطاہوا۔ روایت ہے کہ اس موقعہ پر تسمیہ (بسم اللہ الرحمٰن الرحیم) کو بطور خاص ستر ہزار فرشتوں کے جلو میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچایا گیا۔

کیاان واضح دلیلوں کے بعد بھی عیسائی معترضین اپنے الزام پر اصرار کریں گے، لیکن اگراب بھی ان کاضدی پن اور جحود بر قرار رہے توان کیلئے یہ بات کافی ہے کہ معوّذتین کے ابن مسعودؓ کے انکار سے عیسائیوں کو کوئی فائدہ نہیں اس لئے کہ ان میں تثلیث کا ردّ مذکور نہیں ہے۔ ہاں! جن آیات میں تثلیث والوہیتِ مسیح کا ردّ مذکور ہے۔ اگر ان کو ابن مسعودؓ کے حوالے سے پیش کریں تو کوئی بات ہو سکتی ہے۔

اعتراض دوم۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد جب مسلمانوں کی باہمی خانہ جنگیوں کا نتیجہ شہادت علی مرتضیٰؓ، حضرت امام حسنؓ کی خلع خلافت اور بنی امیّہ کی حکومت کی شکل میں ظاہر ہوا تو جھوٹی روایات کا ایک سلسلہ قائم ہو گیا۔ شیعانِ علیؓ بنی امیّہ کے ساتھ ساتھ خلفائے ثلاثہ راشدہ اور متعدّد صحابہ کرام کو مطعون کرنے لگے۔ اگرچہ حضرت عثمانؓ نے لوگوں کو قرآن مجید کے ایک متفق علیہ نسخہ اور ایک لہجہ پر جمع کر کے اور تحریف وتبدیل سے بچاکر دین کی ایک بہت بڑی خدمت سرانجام دی، مگر عداوت کی آنکھ میں اُن کی یہ خدمت اُن کا عیب بن گیا۔ ان پر کلام پاک کی تدوین کے سلسلے میں طرح طرح کے الزامات لگائے گئے۔ بے سروپا روایات گھڑی گئیں۔ اور اس قرآن کو جس کی حفاظت کا وعدہ (اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحَافِظُوْنَ) خداتعالیٰ نے خود فرمایا ہے، صرف عداوتِ عثمانؓ کی وجہ سے آئندہ نسلوں کے لئے مشکوک کرنے کی کوشش کی گئی اور غیروں کو جگ ہنسائی کا موقع فراہم کیا گیا۔

اہل سنّت کی بعض کتبِ حدیث میں مثلاً طبرانی و بیہقی، جن کو حضرت شاہ ولی اللہؒ تیسرے درجہ کی کتب احادیث میں شمار کرتے ہیں، اس قسم کی روایات کو بغیر تنقید کے بجنسہٖ نقل کر دیا گیا۔ جن کے راوی شیعہ ہیں۔ مثلاً طبرانی کتاب الدّعا میں یہ روایت نقل کی گئی ہے کہ (راوی کہتا ہے):

"مجھ سے عبدالملک بن مروان نے یہ بات کہی کہ تُو کس وجہ سے ابوتراب (حضرت

© rasailojaraid.com

علیؓ) کے ساتھ محبت رکھتا ہے۔ وہ تو بس ایک خشک دماغ دیہاتی شخص ہے۔ " میں نے کہا " واللہ میں نے اس وقت میں قرآن کو جمع کیا جبکہ تیرے ماں باپ اکٹھے بھی نہ ہوئے تھے اور اس قرآن میں سے علی ابن ابی طالبؓ نے دو سورتیں مجھ کو سکھائی تھیں۔ جوان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص طور پر تعلیم کی تھیں۔ اور وہ سورتیں ایسی ہیں جن کو نہ تو نے سیکھا ہے اور نہ تیرے باپ نے ان کی تعلیم پائی تھی۔ وہ سورتیں یہ ہیں۔

اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَسْتَعِيْنُكَ وَنَسْتَغْفِرُكَ وَنُثْنِيْ عَلَيْكَ وَلَا نَكْفُرُكَ وَنَخْلَعُ وَنَتْرُكُ مَنْ يَّفْجُرُكَ۔ اَللّٰهُمَّ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَلَكَ نُصَلِّيْ وَنَسْجُدُ اِلَيْكَ نَسْعٰى وَنَحْفِدُ وَنَرْجُوْا رَحْمَتَكَ وَنَخْشٰى عَذَابَكَ اِنَّ عَذَابَكَ بِالْكُفَّارِ مُلْحِقٌ۔ (یہ دعائے قنوت ہے)

مذکورہ بالا روایت میں پانچ راوی ہیں۔ (۱) عباد بن یعقوب کو علامہ ذہبی نے میزان الاعتدال میں غالی شیعہ اور رؤس بدعت لکھا ہے۔ (۲) یحیٰی بن یعلیٰ اسلمی کو میزان الاعتدال میں مضطرب الحدیث لکھا گیا ہے۔ باقی تین راویوں کے بارے میں بھی اسقام کا محدثین نے اظہار کیا ہے۔ اب اگر ہم تھوڑی دیر کے لئے اس روایت کو مان لیں تو صورتِ حال کچھ یوں بنتی ہے کہ راوی یعنی عبداللہ بن زریر الغافقی نے حضرت علیؓ سے دعائے قنوت سیکھی۔ اور اسے عبدالملک کے سامنے پڑھا، لیکن اخیر راوی عباد بن یعقوب نے (جو غالی شیعہ تھا اور قرآن میں حذف واضافہ کا قائل تھا) دعا کی بجائے اسے سورۃ کہہ دیا حالانکہ یہ پوری عبارتیں دعائے قنوت سے ماخوذ ہیں۔ جو آج تک نمازِ عشاء کے وتروں میں پڑھے جاتے ہیں، لیکن ان کو کبھی داخلِ قرآن نہیں سمجھا گیا۔ ہاں! یہ ممکن ہے کہ کچھ لوگوں نے اس دعا کو اجزائے قرآن کے ساتھ لکھ لیا ہوگا۔ اس لئے کئی لوگوں کو اس کے شاملِ قرآن ہونے کا دھوکہ ہوگیا۔ اور پھر یار لوگوں نے دوسرے تمام حقائق کو پس پشت ڈالتے ہوئے تحریفِ قرآن کے نظریہ کا پرچار کیا۔ جیسا کہ مصحف اُبی بن کعب کی نسبت کہا جاتا ہے کہ اس میں الحفد اور الخلع نامی دو سورتیں تھیں۔ حالانکہ نحفد اور نخلع کے جو الفاظ دعائے قنوت میں مذکور ہیں انہیں میں سے یہ دو سورتوں کے نام تراش لئے ہیں۔ سورتوں کی عبارت بھی دعائے قنوت والی ہے۔

محمد بن یعقوب الکلینی (مشہور شیعہ عالم) نے اپنی حدیث کی کتاب "کافی" میں

© rasailojaraid.com

اس قسم کی روایتیں درج کی ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جہاں جہاں حضرت علیؓ کا نام اور اہل بیت کا ذکر تھا وہ مقامات کلام پاک سے خارج کر دیئے گئے۔ ان روایات کو علی بن ابراہیم القمی نے اپنی تفسیر "القمی" میں آب و تاب سے بیان کیا۔ پھر لکھ دیا کہ صحیح کلام مجید وہ ہے جس کو حضرت علیؓ نے جمع فرمایا تھا۔ اب وہ امام غائب یعنی بارہویں امام مہدی علیہ السلام کے پاس موجود ہے جو کہ اس کے ظہور کے ساتھ ہی آئے گا۔ (مقدمہ تفسیر صافی)

بعض نے کہا کہ اصل قرآن مجید چالیس سپاروں پر مشتمل تھا جسے حضرت ابو بکر صدیقؓ کی بکری کھا گئی۔ بعض شیعہ علماء کے پاس اب بھی ایسی آیات پائی جاتی ہیں، جو اُن کے خیال میں اصل قرآن مجید میں موجود تھیں، مگر حضرت صدیق اکبرؓ نے تدوینِ قرآن کے وقت انہیں حذف کر دیا۔ کئی شیعہ مؤرّخوں اور علماء نے لکھا ہے کہ "اصل قرآن مجید کے آنے تک موجودہ قرآن مجید کے مطابق ہی زندگی گزارنا ضروری ہے۔" لیکن قرآن مجید کے بارے میں شیعہ حضرات کے یہ عقائد درج ذیل وجوہ سے لغو اور بے اصل قرار پاتے ہیں۔

(۱) چالیس سالہ دورِ خلافت راشدہ (جس میں پانچ سال حضرت علیؓ کی اپنی خلافت کے ہیں) میں حضرت علیؓ نے اصل قرآن کی نشاندہی کیوں نہ کی۔

(۲) دورِ صدیقیؓ، فاروقیؓ اور عثمانیؓ میں آپؓ نے دوسرے معاملات میں خلفاء اور صحابہ سے اختلاف کیا۔ تدوینِ قرآن کی تحریف پر کیوں آواز بلند نہ کی۔

(۳) مختلف مواقع پر جہاں بھی حضرت علیؓ نے (فیصلوں میں اپنے دعاوی کے ثبوت میں وغیرہ) قرآن کو پیش کیا اسی موجودہ قرآن کو پیش کیا۔ اُس وقت آپ نے اصل کلام پاک کا تذکرہ کیوں نہ کیا؟

(۴) روایات سے یہ بات ضرور مذکور ہے کہ حضرت علیؓ نے قرآن مجید (یا اس کے کچھ اجزاء) اپنی تلوار کی میان میں رکھے ہوئے تھے۔ مگر کیا یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ یہ قرآن یا اجزاء مصحفِ صدیقیؓ سے مختلف تھے؟

(۵) حضرت علیؓ اور اولادِ علیؓ دوسرے معاملات اور سیاسی بدعنوانیوں پر حکمرانوں سے ٹکر لے سکتے ہیں، سر کٹوا سکتے ہیں، مگر ان کی آنکھوں کے سامنے قرآن میں تحریف ہو رہی ہے اور وہ خاموش ہیں۔ کیوں؟ اگر یہ خاموشی بربنائے "تقیہ" ہے تو کیا یہ تقیہ بزدلی اور ایمان سے محرومی کی علامت نہیں۔ جبکہ علیؓ و اولاد علیؓ کے نقشِ قدم "ایمان" کے درجات کی

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

طرف نشاندہی کرتے ہیں۔

اب ان محققین علماءِ شیعہ کے اقوال پیشِ خدمت ہیں جنہوں نے حذف و اضافۂ قرآن والی روایتوں پر خود کلام کیا ہے۔ علامہ ابو علی الطبرسی لکھتے ہیں۔

"انہیں میں سے ایک بحث یہ ہے کہ قرآن مجید میں زیادتی یا کمی ہوئی یا نہیں۔ یہ بحث فنِ تفسیر سے متعلق ہے۔ یہ امر کہ قرآن میں کچھ زیادتی ہوئی، سب کے نزدیک باطل ہے۔ باقی رہا نقصان، تو ہماری جماعت میں سے ایک گروہ نے اور سُنّیوں نے حشویہ سے روایت کیا ہے کہ قرآن میں تغیّر اور نقصان ہو گیا ہے، لیکن ہمارے فرقہ کا صحیح مذہب اس عقیدہ کے خلاف ہے اور سید مرتضیٰؒ نے اسی کی تائید کی ہے۔ اور مسائل طبرسیات کے جواب میں اس پر نہایت مفصل بحث کی ہے۔ سید مرتضیٰ نے متعدد مواقع پر لکھا ہے کہ قرآن کی صحت کا علم ایسا یقینی ہے جیسا مشہور شہروں کا علم اور بڑے بڑے واقعات اور مشہور کتابوں اور عرب کے مدوّن اشعار کا علم۔ کیونکہ قرآن کی نقل اور حفاظت کے اسباب کثرت سے تھے۔ اور اس حد تک پہنچے تھے کہ کسی اور چیز کے سنے نہیں گئے۔ اس لئے کہ قرآن نبوت کا معجزہ اور علوم شرعیہ اور احکامِ دینیہ کا مآخذ ہے۔ اور علمائے دین نے اس کی حفاظت اور حمایت میں انتہا درجہ کی کوشش کی۔ یہاں تک کہ قرآن کے اعراب، قرأت، حروف و آیات کے اختلافات تک انہوں نے محفوظ رکھے۔ اس لئے کیوں کر قیاس ہو سکتا ہے کہ اس احتیاط شدید کے ہوتے ہوئے اس میں نقصان یا تغیّر آنے پائے۔ اور سید مرتضیٰؒ نے یہ بھی کہا ہے کہ قرآن مجید آنحضرت صلعم کے زمانہ میں مکتوب اور حافظوں میں مرتب تھا، جیسا اب ہے اور اس پر دلیل یہ ہے کہ قرآن اس زمانے میں پڑھا جاتا تھا اور لوگ اس کو حفظ کرتے تھے۔ اور نبیؐ کو سناتے تھے اور متعدد صحابہ مثلاً عبداللہ بن مسعودؓ اور ابی بن کعبؓ وغیرہ نے قرآن کو آنحضور صلعم کے سامنے چند بار ختم کیا تھا۔ ان سب باتوں پر غور کرنے سے بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ قرآن مکمل اور مرتب تھا۔ علامہ طبرسی نے بھی کہا ہے کہ جو امامیہ یا حشویہ اس (قرآن) کے مخالف ہیں، ان کی مخالفت قابل اعتبار نہیں کیونکہ اس میں جن لوگوں نے اختلاف کیا ہے وہ اہل حدیث میں سے ایک گروہ ہے اور انہوں نے ضعیف روایتیں نقل کی ہیں۔ ہمارا اعتقاد ہے کہ وہ قرآن جس کو خدا نے اپنے نبیؐ پر اتارا ہے، وہی ہے جو دفّتین کے درمیان تھا۔ اور جو لوگوں کے پاس ہے اُس سے کچھ زائد نہیں ہے۔ جو لوگ ہماری

© rasailojaraid.com

طرف نسبت کرتے ہیں کہ قرآن، موجودہ قرآن سے زیادہ تھا وہ جھوٹے ہیں"۔ (تفسیر مجمع البیان جلد اول)

قاضی نور اللہ شوستری اگرچہ خلفائے ثلاثہ کو سختی سے مورِدِ لعن و طعن ٹھہراتے ہیں، مگر کلام مجید کے متعلق ان کا عقیدہ یہ ہے کہ

"شیعہ امامیہ کی طرف یہ بات جو منسوب کی گئی ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ قرآن میں تغیّر ہوا ہے، جمہور امامیہ اس کے قائل نہیں ہیں۔ اس کا قائل صرف ایک چھوٹا سا گروہ ہے، جو کسی شمار میں نہیں"۔ (مصائب۔ النواصب)

درج بالا شیعہ فرقہ کے چوٹی کے علماء کے اقتباسات کے مطالعہ کے بعد یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ تحریفِ قرآن کا نظریہ رکھنے والوں کو قاضی نور اللہ شوستری کسی شمار میں نہیں رکھتے، رئیس المحدثین محمد بن علی بابویہ القمی کتاب الاعتقادات میں ایسے لوگوں کو کاذب قرار دیتے ہیں۔ علامہ طبرسی انہیں ناقابلِ اعتبار اور باطل قرار دیتے ہیں۔ اور جو نظریہ رکھتے ہیں یا جو اس نظریہ والوں کو اپنے دعویٰ (تحریفِ قرآن) کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں انہوں نے بھی اپنے زعمِ باطل کے ثبوت میں کسی زمانہ میں بھی کسی شیعہ، کسی ولی، کسی امام، کسی صحابیؓ وغیرہ کے ہاتھ کا لکھا ہوا قلمی نسخہ قرآن آج تک پیش نہ کیا۔ تمام گروہوں اور فرقوں کا، خواہ وہ معاندینِ صدیقؓ ہوں یا مخالفینِ عثمانؓ، اسی مصحفِ عثمانیؓ پر اتفاق ہے جو مصحفِ صدّیقیؓ کی نقل ہے۔

مخالفینِ اسلام کا یہ بھی خیال ہے کہ "قرآن کی ترتیب میں کوئی خوبی نہیں۔ پہلے بڑی سورتیں، پھر چھوٹی سورتیں جمع کر دی گئی ہیں۔" اس سوال کا جواب دینے سے قبل ہم سورتوں کی ترتیب پر تھوڑا سا غور کرتے ہیں۔ قرآن مجید کی موجودہ ترتیب اس طرح ہے کہ سورۃ الفاتحہ کے بعد پہلے سبع طوال یعنی سات بڑی سورتیں (بقرہ۔ آل عمران۔ نساء۔ مائدہ۔ انعام۔ اعراف۔ انفال) ہیں۔ اس کے بعد مِئین یعنی وہ سورتیں جن میں کم و بیش ایک سو آیات ہیں (سورۃ یونس سے سورۃ فاطر تک) پھر مثانی، جن میں قصص و نصائح کی تکرار ہے۔ اور یہ سورتیں سو آیتوں سے کم ہیں۔ (سورۃ یٰسٓ سے قٓ تک) پھر مفصّل یعنی چھوٹی چھوٹی سورتیں ہیں۔ (سورۃ قٓ سے سورۃ ناس تک) اس طرح کل ایک سو چودہ سورتیں بنتی ہیں۔ یہ ترتیب "ترتیب نبویؐ" ہے۔ اب اگر اس ترتیب پر غور کیا جائے اور

© rasailojaraid.c
© rasailojaraid.c

معترضین کی بات کو درخود اعتنا سمجھا جائے، تو سوال یہ ہے کہ مئین (ایک سو آیات والی سورتیں) میں سورۃ رعد جس میں صرف ۴۳ آیات ہیں، سورۃ ابراہیم جس میں ۵۲ آیات ہیں سورۃ نور جس میں ۶۴ آیات ہیں، شامل کر دی گئی ہیں۔ جبکہ ان کو مثانی (قصص و نصائح کی تکرار اور ایک سو آیات سے کم طوالت) میں ہونا چاہئے تھا۔ اسی طرح مثانی میں شامل سورۃ الصافات کو، جس میں ۱۸۲ آیات ہیں، ترتیب کے مطابق مئین میں ہونا چاہئے تھا۔

دوسری طرف ترتیبِ ابن مسعودؓ اور ترتیب علیؓ مرتضیٰ جو ایک دوسری سے مخالف اور انفرادی (ترتیب میں) تھیں، پسند نہیں کی گئیں۔ حضرت علیؓ کی ترتیب کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس میں شانِ نزول کے لحاظ سے سورتیں جمع تھیں۔ بے شک تاریخی حیثیت سے یہ ترتیب بہت مناسب تھی، لیکن اکثر ایک ہی وقت میں پوری پوری سورۃ نازل نہیں ہوئی تھی۔ اس لئے یکے بعد دیگرے مکمل سورتیں جمع نہیں ہو سکتی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت علیؓ نے اس ترتیب سے رجوع کر کے ترتیبِ "عثمانی" کو جو دراصل ترتیبِ نبوی ہی تھی، اپنے عہد میں جاری رکھا جو کہ اجماعِ صحابہؓ سے وجود میں آئی تھی۔ اور یہی ترتیب عثمانیؓ (دراصل ترتیبِ نبویﷺ) ہے، جو آج تک مروّج ہے اور قیامت تک مروّج رہے گی۔ اور مخالفین اپنے غیظ و غضب اور آتشِ حسد میں خود جلتے رہیں گے۔

بقیہ: شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن

کا قلع قمع ہوگا"۔۔۔ دہاں اقبال کے شعر کی صداقت الم نشرح ہو جاتی ہے کہ۔

ع شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن

اللهم ارزقنا شهادة فی سبیلك واعف عنا واغفرلنا وارحمنا انت مولانا فانصرنا علی القوم الکافرین واغفرلنا ولاخواننا الذین سبقونا بالایمان ولا تجعل فی قلوبنا غلا للذین آمنوا ربنا انك رؤف رحیم۔

© rasailojaraid.com

ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم

خودی اور فلسفۂ تاریخ

تاریخ کے ناقص فلسفے

© rasailojaraid.com

انسانی افراد اور جماعتوں کے افعال کے سلسلہ کو انسانی تاریخ کہتے ہیں لیکن کیا انسانی اعمال جن سے تاریخ کا تار و پود بنتا ہے کسی قاعدے یا قانون کے پابند ہیں، کیا ان کا کوئی مقصد ہے کیا ان کی کوئی سمت یا منزلِ مقصود ہے۔ اگر ہے تو وہ کیا ہے۔ قومیں اور تہذیبیں کیوں اُبھرتی ہیں، کیوں مٹتی ہیں۔ کیا ان کے عروج و زوال کا کوئی اصول ہے۔ کیا کوئی قوم یا کوئی تہذیب ایسی بھی ہو سکتی ہے جو قوموں اور تہذیبوں کو مٹانے والے عوامل کی زد سے محفوظ رہ سکتی ہو اور ارتقائے عالم کی منزلِ مقصود ہو۔ اس قوم کے اوصاف اور امتیازات کیا ہوں گے۔ کیا ہم ایسی قوم کو وجود میں لا سکتے ہیں، کیا ہم اپنے آپ کو ایسی قوم بنا سکتے ہیں۔ وعلیٰ ہذا القیاس۔ بہت سے فلسفیوں نے جن میں ڈینی لیوسکی (DENILEVSKY) سپنگلر (SPENGLER) ٹائنبی (TOYNBEE) اور سوروکن (SOROKIN) زیادہ مشہور ہیں، اپنی بالعموم غیر معمولی اور غیر ضروری طوالت کی تصنیفات میں اس قسم کے بعض سوالوں کے جوابات دینے کی کوشش کی ہے لیکن اُن کے جوابات مبہم اور غیر واضح اور اُلجھے ہوئے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں سے کسی نے بھی اس بات کو ملحوظ نہیں رکھا کہ انسان کے اعمال انسان کی فطرت سے سرزد ہوتے ہیں۔ لہٰذا جب تک پہلے انسان کی فطرت کا ایک معقول اور صحیح نظریہ پیدا نہ کیا جائے، تاریخ کے واقعات کے پیچھے جو قوانینِ قدرت کام کر رہے ہیں اُن کو سمجھنا ممکن نہیں۔ تاریخ سب سے پہلے فردِ انسانی کی فطرت کے اندر جنم لیتی ہے۔ فردِ انسانی کے اعمال قوموں اور تہذیبوں کی تاریخ کی اکائی (UNIT) کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جب تک اس اکائی کو نہ سمجھا جائے ممکن نہیں کہ ہم ان بڑے بڑے مجموعوں

© rasailojaraid.com